سید احمد خاں

رسم و رواج کی اصلاح

جس کو انگریزی میں مینرز اور کسٹم کہتے ہیں، رسم اس کام کا نام ہے جو ہمارے پرکھوں سے ہوتا چلا آیا ہے گو کہ اب ہم کو یہ بھی نہ معلوم رہا ہو کہ وہ کیوں ہوتا تھا اور اس سے کیا فائدہ ہے۔

رواج اس کام کا نام ہے جس کو سب لوگ کرتے ہوں یا کرنے لگیں اور اس کے کرنے کو لوگ کچھ عیب نہ سمجھیں۔ پس ہو سکتا ہے کہ ایک زمانہ میں کوئی کام عیب گنا جاتا ہو مگر جب وہ رواج پا جائے تو لوگوں کی آنکھ میں کچھ عیب نہ رہے۔

انگریز مصنفوں نے 'کسٹم' یعنی رسم کی تعریف زیادہ وضاحت سے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک کام کا ہمیشہ بار بار کرتے رہنا یا کسی کام پر مدتوں سے بطور قانون کے عمل درآمد چلا آنا رسم کہلاتا ہے۔ رسم ہمیشہ ایک بن لکھا قانون ہوتا ہے جس پر سب لوگ مدت سے اتفاق کرتے چلے آتے ہیں اور اس لیے وہ رسم بطور ایک قانون کے سند ہو جاتی ہے۔

سر والٹر ریلی نے نہایت عمدہ بات کہی ہے کہ رسم اور رواج میں وہ فرق ہے جو سبب اور نتیجہ میں ہے کیونکہ جب کسی کام کا رواج مدت تک رہتا ہے تو وہ بطور ایک قانون کے لوگوں میں پھیل جاتا ہے اور آخر کو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ایک رسم ہو جاتی ہے۔

عادت میں اور رسم میں ایک نہایت باریک تفاوت ہے۔ عادت خود ہماری طبیعت کا ایک اصول ہے جو خود ہم میں سے پیدا ہوا ہے اور جو بالطبع اور بے تکلف ہم کو کسی کام کے بار بار کرنے کو کہتا ہے۔ رسم ایک ایسا اصول ہے جو باہر سے ہم میں آیا ہے جس کے سبب سے ہم کسی کام کو بار بار کرتے ہیں مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے مدد ملتی ہے مثلاً دان پن خیرات و زکوٰۃ دینے کی رسم سے فیاضی کی عادت پیدا ہوتی ہے اور پوجا کرنے اور نماز پڑھنے کی رسم سے مندروں میں اور گرجاؤں میں اور مسجدوں میں جانے کی عادت ہو جاتی ہے۔

لفظ کسٹم یعنی رسم کا علم قانون میں بھی آتا ہے اور مقنن اس کے یہ معنی بتاتے ہیں کہ "رسم ایک ایسا

قانون ہے جو کبھی تحریر میں نہیں آیا مگر مدتوں سے اور عام لوگوں کی رضامندی سے جاری ہے۔" رسم و رواج ایک بڑا حصہ ملکی قوانین کا ہوتا ہے اس کا وجود ہر ایک ملک اور ہر ایک عملداری میں پایا جاتا ہے۔ انگلستان میں جو قوانین کہ کامن لا کہلاتے ہیں وہ حقیقت میں وہی بن لکھے قوانین ملکی رسم و رواج کے ہیں۔ بڑے بڑے قانون دانوں نے کامن لا کے یہی معنی بیان کئے ہیں کہ "انگلستان کا قدیمی رواجی قانون" پس ہمارے ہندوستان میں جو رسم و رواج ہے وہ ہمارے ملک کا کامن لا ہے۔ انگلستان میں تین قسم کے قانون جاری ہیں۔ ایک کامن لا یعنی رسم و رواج کا بن لکھا قانون۔ دوسرا اسٹیٹیوٹ لا یعنی قوانین تحریری جن کو واضع قوانین نے بنایا اور گورنمنٹ نے ان کو جاری کیا۔ تیسرا ایکیوٹی یعنی قدرتی انصاف کا قانون مگر ان تینوں قسموں کے قانونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ تحریری قانون سے رواجی قانون یعنی کامن لا منسوخ ہو جاتا ہے اگر ان دونوں میں مخالفت ہو لیکن اگر ایکیوٹی یعنی انصافی قانون کے قاعدے اُس کے برخلاف ہوں تو کامن لا یعنی رواجی قانون بحال ہو رہتا ہے اگرچہ میری رائے میں ایسا ہونا انسان کے لیے نہایت افسوس کی بات ہے کیونکہ ایسی حالت میں رواج کے نیچے قدرتی انصاف دب جاتا ہے۔ مگر تمام مقننوں کی رائے ہے کہ کامن لا یعنی رواجی قانون ایسا ہو جو تحریر میں نہ آیا ہو اور اس کے قاعدے زبانی روایتوں پر چلے آتے ہوں مگر رسم و رواج کو قانونی رتبہ حاصل ہونے کے لیے اتنا پرانا ہونا ضرور ہے کہ اس کے برخلاف ہونا لوگوں کی یاد سے باہر ہو۔

یہ نہ سمجھنا کہ کامن لا کے لیے کچھ تحریری کتابیں نہیں ہوتیں بلکہ کامن لا پر نہایت بڑی بڑی کتابیں بہت بڑے لائق اور قابل اور واقف کار عالموں نے لکھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کامن لا پہلے جاری ہوتا ہے اور پھیل جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ضبط تحریر میں آتا ہے یا اس پر کتابیں لکھی جاتی ہیں اور تحریری قانون اول تحریر میں آتا ہے اور اس کے بعد جاری ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔

نازک بحث اس مقام پر یہ ہے کہ مذہبی قانون کس میں داخل ہے تحریری قانون میں یا رواجی قانون میں۔ میں اس بات میں کسی مصنف کی رائے سے واقف نہیں ہوں مگر میں مذہبی قوانین کو پچھلی قسم میں سمجھتا ہوں۔ کوئی مذہبی قانون یہاں تک کہ موسیٰ کے دس حکم بھی ایسے نہیں ہیں جن کا رواج قبل ان کے لکھے جانے کے نہ ہو چکا ہو۔ بانی مذہب گو کہ وہ خدا ہی کی طرف سے آیا ہو وعظ و نصیحت سے ایک بات کا رواج دینا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ان کے گروہ معتقدین میں رواج پا جاتی ہے اور جب کہ اس پر ایک عرصہ گزر جاتا ہے تو وہ بمنزلۂ قانونی مذہبی کے یعنی ایسی رسم کے جو ایک مذہب کی بنا پر جاری ہوئی مستند ہو جاتی ہے۔ پرانے مذہب کے لوگوں میں بہت سی رسمیں انسان کی یاد سے پہلے سے جاری ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیوں جاری ہوئی تھیں اور ان سے

کیا فائدہ ہے اور اب ہم کیوں ان کو کرتے ہیں۔ پس اب وہ تمام باتیں بجز اس کے کہ رسم و رواج میں داخل ہوں اور کسی میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ میری رائے ہے کہ مذہب بھی رسم و رواج پیدا ہو جانے کا ایک سبب ہوتا ہے۔ مگر جب تک کہ اس کے مسائل بطور رسم کے جاری نہ ہو جائیں رسم و رواج سے زیادہ قوت نہیں رکھتا۔ اکثر قوموں میں بلکہ دنیا کی کل قوموں میں بہت سی ایسی رسمیں پائی جائیں گی جو درحقیقت ان کے مذہب کے برخلاف ہیں مگر اُن رسموں نے ان کے دلوں میں ایسی مضبوط جڑ پکڑی ہے کہ مذہب کی نہایت زبردست اور طاقت ور کل بھی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گئی ہے۔

رسم و رواج کی حکومت انسانوں کے دلوں پر نہایت قوی اور سب سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ ہر شخص غلام سے بھی زیادہ اس کی تابعداری کرتا ہے۔ آقا کو اپنے غلام پر کبھی کبھی نافرمانی کرنے کا اندیشہ ہوتا ہے مگر رسم و رواج کو اپنے غلاموں کی نسبت نافرمانی کا کبھی اندیشہ نہیں ہوتا۔

تعجب یہ ہے کہ جاہل اور عالم نادان اور عقلمند سب برابر اس کی غلامی کرتے ہیں۔ اچھا قابل اور لائق آدمی جو فلاسفی اور حکمت کے باریک باریک مسئلے حل کرتا ہے جب ان باتوں تک پہنچتا ہے جن کا رسم و رواج مدت سے چلا آتا ہے تو تمام اپنی قابلیت اور عقل و تمیز کو بھول جاتا ہے اور محض نادان شخص کی مانند اس کے آگے سر جھکا لیتا ہے کس قدر ہم کو تعجب آتا ہے جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سقراط سا شخص جس نے اپنی قوم کے ریفارم کرنے میں اپنی جان دی جب کہ زہر کے پیالہ کا اپنی جان پر اثر پاتا ہے اور اپنی زندگی کو چند لمحہ سے زیادہ نہیں سمجھتا اس وقت اپنے پیارے دوست کریٹر کو وصیت کرتا ہے کہ وہ اس کی منت کو جو اس کو لیبی اس دیوتا پر مرغی چڑھانے کی تھی پوری کرے۔ اس واقعہ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ رسم و رواج کا انسان کے دلوں پر اور سقراط کے سے دل پر بھی جس کے دل کو گویا خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا کیسا کچھ قوی اثر ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات بلاشبہہ تسلیم کرنے کے لائق ہے کہ جو رسم مذہبی سند پر یا مذہبی خیال پر قائم ہوتی ہے اُس کا اثر انسانوں کے دلوں پر بہ نسبت اُن رسموں کے جو اور طرح پر قائم ہوئی ہوں بہت زیادہ سخت اور نہایت قوی ہوتا ہے۔

اس میرے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسم و رواج کا تعلق مذہب اور حکومت اور معاشرت سب سے برابر ہے۔ مگر میں اس موقع پر اس بات سے کچھ بحث نہیں کروں گا کہ جو رسمیں دنیا کی قوموں میں جاری ہیں ان میں سے کون سی اچھی اور کون سی بُری ہیں۔ بلکہ میں اس بات پر بحث کروں گا کہ رسومات معینہ میں خواہ وہ مذہب سے علاقہ رکھتی ہوں یا حکومت و معاشرت سے اصلاح اور ترقی کی ضرورت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو وہ کیونکر ہو سکتی ہے۔

جو لوگ مذہبی رسومات کے پابند ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہی رسمیں سچائی اور انسان کی بھلائی کے لیے نہایت اعلیٰ درجہ کمال پر ہیں اور ان سے زیادہ ترقی کرنا ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ان میں ترقی یا اصلاح کرنی چاہے دگو کہ وہ اسی مذہب کی سند پر کرتا ہو جس مذہب کی وہ رسمیں ہیں) تو اس کو کافر اور مذہب سے خارج قرار دیں گے اس کا ٹھکانہ بجز جہنم کے اور کہیں نہیں بتلائیں گے۔ مگر ہماری تسلی کو صرف یہی بات کافی نہیں ہے کیونکہ اب تک ایک نہایت ضروری بات پر خیال نہیں کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان رسومات مذہبی کا اثر ہمارے دل پر درحقیقت ان کی سچائی کے سبب ہے یا ہماری عادت کا جس کی ہم کو اپنے بچپن سے عادت پڑ گئی ہے۔

رسم جو حکومت سے متعلق ہے اُس پر پابند رہنے کے لیے بڑے بڑے مشہور مقنن اور عالم طرفدار ہیں۔ ٹیسی ٹس رومی مؤرخ کا قول ہے کہ "جس سلطنت میں زیادہ قانون ہوتے ہیں اس میں اتنی ہی زیادہ برائی ہوتی ہے"۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالباً میرے ملک کے لوگوں کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ہندوستان قانون کے بوجھ کے تلے دبتا چلا جاتا ہے اور اسی سبب سے اس میں روز بروز پیچیدہ حالات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اودھ کے رہنے والوں نے جو اودھ کے شمال مغربی اضلاع میں شامل ہونے سے اپنی زیادہ نفرت ظاہر کی غالباً اس کا سبب غالب یہی تھا کہ بہ نسبت حال کے ان کا ملک قانون کے بوجھ میں زیادہ دب جائے گا۔ غالباً ہندوستان کے رجواڑے اور ہندوستانی عملداری کو اس لیے زیادہ عمدہ سمجھتے ہوں گے کہ وہاں کی حکومتیں مرجاد یعنی قدیم رسم پر چلتی ہیں اور تمام جھگڑوں کا فیصلہ رسم ورسم کی پابندی سے ایک عامل کی رائے پر ہو جاتا ہے۔

رسم و رواج کے طرفداروں کے لیے رومیوں کی حکومت ایک بہت بڑی مثال گنی جاتی ہے جن کی حکومت میں تمام کام (خواہ وہ عام لوگوں سے متعلق ہوتے تھے خواہ لوگوں کے ذاتی کاموں سے خواہ عدالت کے فیصلوں سے) باپ دادا کی رسم پر مبنی ہوتے تھے یہاں تک کہ مجرموں کو سزا دیتے وقت جس طرح کہ ہم پینل کوڈ کی دفعہ کا حوالہ دے کر سزا دیتے ہیں وہ اپنے باپ دادا کی رسم کا حوالہ دے کر سزا دیتے تھے۔

سیلسٹ رومی مؤرخ لکھتا ہے کہ "ٹارکوین کو جلاوطن کرنے کے حکم میں یہ لکھا گیا تھا کہ "ایک رسم کی تبدیل کے سبب جلاوطن کیا گیا"۔ ورجل مصنف بھی رسم و رواج کا طرفدار ہے اور کرے سسٹم کا قول ہے کہ "وہ قوم غلامی کی حالت میں ہے جس پر قانون حکومت کرتا ہے اور آزاد قوم وہ ہے جس پر رسم و رواج کی حکومت ہوتی ہے"۔

گولڈ اسمتھ لکھتے ہیں کہ رسم و رواج درحقیقت اپنے باپ دادا کے حکموں کو ورثہ کے طور پر لینا ہے جس پر خود بھی لوگ چلتے ہیں اور نہایت خوشی اور رضامندی سے اس کو مانتے ہیں اس لیے ملکی رسم و رواج کا جاری رہنا قومی آزادی کا نشان ہے اور چونکہ یہ رسمیں اس ملک کے معزز و قابل ادب بزرگوں سے چلی آتی ہیں۔

اس لیے اس سے آئندہ کو بھی قومی آزادی کے محفوظ رہنے کو بڑی مدد ملتی ہے۔ مگر مفتوحہ ملک کا حال اس کے برخلاف ہوتا ہے کیونکہ وہاں کی رعایا جو بسبب مفتوح ہونے کے غلاموں کی مانند ہوتی ہے اس کو ایسے رتبوں کا دعویٰ نہیں پہنچتا اس لیے کہ مغلوب ہونے کی ذلت نے ان کے بہادر اور نامور باپ دادا کے آزاد ناموں کے محفوظ رکھنے کا حق بالکل کھو دیا ہے اور اس حق کو فتح مند قوم نے اپنی قوت و جرأت سے لے لیا ہے۔ فتح مندی کو ہمیشہ قوانین کے جاری کرنے اور وہاں کی رعایا کو بعوض قدیمی رسم کے قانون کے پابند رہنے مضبوط کرنا چاہیئے تاکہ وہ قانون ہر گھڑی ان کو یاد دلاتے رہیں کہ وہ فتح کرنے والوں کے غلام ہیں۔ گولڈ اسمتھ صاحب کی یہ رائے ہے کہ ایسی مفتوحہ رعایا پر (جن کے ہاں ان کے معزز باپ دادا کی پرانی رسمیں جاری ہوں جو ہر دم ان کو مفتوحہ ہونے کی ذلت سے اٹھانا چاہتی ہیں اور آزادی اور بغاوت کی ترغیب دیتی ہیں) کسی طرح وفاداری و خیر خواہی کا اعتماد نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاید یہی سبب تھا کہ رومن ریپبلکن رسم و رواج کی نہایت عزت کرتے تھے اور نئے قوانین کے جاری کرنے میں نہایت تامل کرتے تھے اور اسی سبب سے ان کی سلطنت بہت دنوں تک رہی اور تمام دنیا میں بے انتہا نیکیوں کا نمونہ ہوئی۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ قوانین کا فائدہ ان کے ماننے اور ان پر عمل کرنے پر منحصر ہے۔ پس رسم و رواج کے قانون ان کے بانیوں کی عزت کے سبب از خود معزز ہوتے ہیں اور تمام لوگ ان بانیوں کی نیکی اور انتظام کی نقل کرنے میں ہمیشہ مشغول رہتے ہیں۔ اسی سبب سے رومن لوگ اپنے باپ دادا کی یادگاری مذہبی طور پر کیا کرتے تھے اور مدتوں تک اسی طرح عمل درآمد کرنے سے ان کے ہاں کی معزز و قابل ادب رسموں کی گردن پر نئے قوانین کی موٹی موٹی اور بھاری بھاری جلدیں سوار نہ ہوئی تھیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرے ہندوستانی بھائی گولڈ اسمتھ کے اس فقرہ کو سن کر بہت خوش ہوئے ہوں گے اور ان کے دل میں اس بات کا خیال گزرا ہو گا کہ ہندوستان کی حکومت بھی اسی رومی اصول پر ہونی چاہیئے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ ابھی تھوڑا سا صبر کریں کہ مجھے ابھی کچھ اور کہنا ہے۔

گولڈ اسمتھ پھر رسم و رواج کی طرفداری کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ قومی رسموں نے بسبب اپنے پرانے اور سیدھے سادے اور مختصر ہونے کے ایک نہایت بزرگ اور ہمیشہ قائم رہنے والی صورت پیدا کر لی ہے جس کی دل میں بڑی عزت بیٹھ گئی ہے مگر نئے قانون جو بڑی بڑی جلدوں میں لکھے جاتے ہیں وہ لوگوں کو گھبرا دیتے ہیں اور ہمیشہ ادل بدل ہوتے رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ان کو بھول جاتے ہیں اور ان کو حقیر سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کام انسان کرتا ہے اس میں ضرور بڑی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں۔

اور اس لیے ضرور ہے کہ ان قانونوں میں بھی کچھ غلطیاں اور نقصان ہوں اور پھر وہ غلطیاں اور نقصان جلد معلوم بھی ہو جاتے ہیں اور ایک جزو میں نقصان ثابت ہونے سے تمام قوانین حقارت کے قابل ہو جاتے ہیں۔ رسومات جو قدیم سے چلی آتی ہیں شاید ان میں بھی کچھ نقصان ہوں مگر لوگ ان نقصانوں پر کچھ لحاظ نہیں کرتے بلکہ ان کی حمایت میں ایک دوستانہ تعصب برتتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک قانون نہایت انصاف سے بھرا ہوا ہے اور ضروری بھی ہے اور اس کے برخلاف کوئی دلیل بھی نہیں ہے تو بھی لوگ اس قانون کی عزت نہیں کرتے۔ مگر رسم و رواج کے برتنے میں وہ بالکل اندھے ہو جاتے ہیں اور اس کی غلطیوں کو خود دیکھتے اور سمجھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے بلکہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے عقلمند اور دور اندیش باپ دادوں نے جو کچھ کیا ہے وہ کچھ سمجھ کر کیا ہے اور کوئی نہ کوئی اس کا سبب ہوگا اگرچہ اب ہم اس کا سبب نہیں جانتے مگر جو فائدے کہ اس رسم کے مقرر کرنے سے تھے اس رسم کے کرتے رہنے سے برابر ہم کو ملتے رہتے ہیں گو کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا فائدے تھے اور کیونکر ہم کو ملتے ہیں

ایک اور رومی قانون دان سب سے بڑھ کر ایک بات کہتا ہے اس کا قول ہے کہ جو رسمیں ہمارے باپ دادا نے مقرر کی ہیں ان کا سبب ہم نہیں بتا سکے اور ہم کو ان کا سبب تلاش کرنا نہیں چاہیئے ورنہ جس بات کی خوبی پر ہم کو کامل یقین ہے اس میں شک پڑ جائے گا۔

یہ وہ دلیلیں ہیں جو رسم و رواج کے طرفداروں نے نہایت مضبوط مضبوط سمجھ کر بیان کی ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ اس کی مخالفت کسی نے نہیں کی ہے۔ مانٹیسک مشہور رومی مصنف اس رائے کے بالکل برخلاف ہے۔ اُس کا قول ہے کہ "جس قوم میں جس قدر زیادہ تحریری قانون ہوتے ہیں وہ اتنی ہی زیادہ آزاد ہوتی ہے۔ اس نے پرشیا کے بادشاہ کو نہایت حقارت سے دیکھا ہے جس نے اپنے ملک کے تحریری قوانین بہت گھٹا دیئے تھے۔" بعضوں کا قول ہے کہ "اس سے زیادہ کون ملک نفرت اور حقارت کے قابل ہے جہاں کی حکومت صرف وہاں کے رسم و رواج کے مطابق ہوتی ہے اور کوئی تحریری عمدہ قانون جاری نہیں ہے اور گورنمنٹ اور اس کی رعایا کے حقوق کی کوئی حد بھی نہیں ہے۔" میں رسم و رواج کی پابندی کا طرفدار نہیں ہوں۔ کچھ تھوڑی دیر کے بعد میں آپ صاحبوں کو بتلاؤں گا کہ ان رایوں میں کس قدر غلطی ہے اور مانٹیسک کا قول کیسا ادب کے لائق ہے۔

رسم و رواج کا تعلق جہاں تک کہ مذہب اور حکومت سے تھا اس کا بیان ہو چکا اور معاشرت سے جو اس کا تعلق ہے اس کا بیان باقی ہے۔ مگر میں زیادہ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ کوئی قوم بلکہ

کوئی خاندان ایسا نہیں ہے جس میں ارباب معاشرت ہزارہا اور عجیب عجیب رسمیں جاری نہیں یہاں تک کہ مہذب ممالک میں بھی ہزاروں لغو رسمیں جاری ہیں۔ جبکہ انسانوں کے مزاج میں سے وحشت کم ہوئی اور جانوروں کی طرح جنگل میں رہنے اور خانہ بدوش پڑے پھرنے اور جانوروں کے شکار سے پیٹ بھر لینے اور انہیں کی کھال پہن لینے کے بدلے انہوں نے تمدن اختیار کیا اور آپس میں مل جل کر رہنے لگے اور معاشرت کی حالت پیدا ہونے لگی اسی کے ساتھ رسم و رواج نے بھی ظہور پایا۔ گویا تمدن و معاشرت رسم و رواج پیدا ہونے کا سبب ہے اور پچھلا پہلے کا نتیجہ ہے مگر ان کے قائم ہونے کے اور بھی سبب ہوتے ہیں۔ ملک کی خاصیت۔ مختلف ملکوں کے لوگوں کی مختلف ضرورت۔ قوموں کی طبیعتوں کا اختلاف۔ اُن کے مزوں کا تفاوت جس کو انگریزی میں ٹیسٹ کہتے ہیں۔ ان کے اعضا کی خصوصاً دماغ کی بناوٹ جس سے اعلیٰ یا ادنیٰ درجہ کے طبعی خیالات پیدا ہوتے ہیں اور اخیر کو علم و ہنر کی ترقی۔

رسم و رواج کا تبدیل کرنا اور ان کو ترقی دینا انسانی سوسائٹی کے لیے ایسا ہی ضرور ہے جیسا کہ ہر ایک انسان کو زندگی کے لیے سانس لینا اور متغیر ہوا کو نکالنا اور تازہ حیات بخش ہوا کو اندر کھینچنا اگرچہ ہر ایک شخص سمجھتا ہے کہ ہمارے رسم و رواج میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے لیکن جب کہ ان سببوں پر خیال کیا جائے جو رسم و رواج کے قائم ہونے کے سبب ہیں اور جن کو میں نے ابھی بیان کیا ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ سبب ہی شاید سوائے بعض کے ایسے ہیں جن میں ہمیشہ تغیر و تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور اکثر یہ ہے کہ وہ سبب زمانہ کے گزرنے پر ترقی پاتے جاتے ہیں پس ضرور ہے کہ ان کے نتیجوں یعنی رسموں میں بھی تبدیلی اور ترقی ہو۔ یہ دعویٰ منطقی شکل پر اس طرح قائم ہوتا ہے کہ "رسمیں نتیجہ ہیں زمانہ کی حالت کا اور زمانہ کی حالت ہمیشہ قابل تغیر ہے پس رسمیں بھی قابل تغیر ہیں۔"

یہ خیال کہ ہماری رسموں میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے (گو وہ کیسے ہی مضبوط یقین سے دل میں بیٹھا ہو) بھروسے اور اعتماد کے لائق نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ صرف عادت نے یہ خیال ہمارے دل میں جمایا ہو۔ اس بات کا اندازہ کرنا کہ انسان جن عادتوں میں ابتدا سے پرورش پاتا ہے اور پلتا ہے اور بڑھتا ہے وہ کہاں تک اس میں اثر کر جاتی ہیں اور دوسری طبیعت سی ہو جاتی ہیں حقیقت میں انسان کی طاقت سے بھی بہت زیادہ اور بلند درجہ پر ہے۔ چنانچہ مختلف قوموں کی مختلف رسموں پر لحاظ کرنے سے اس بات کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔

رسومات میں اصلاح کرنے کی ضرورت خود انسان کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتی ہے جبکہ ہم انسانوں کی سوسائٹیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کی تمام رسمیں، کیا مذہب کی اور کیا حکومت کی اور کیا معاشرت کی مختلف پاتے ہیں

مختلف کا لفظ شاید میں نے غلط کہا کیونکہ مجھ کو یوں کہنا چاہیئے کہ ایک کی رسم کو دوسرے کی رسم کے برعکس یعنی نقیض پاتے ہیں اور جو کہ دو نقیضیں کبھی سچ نہیں ہو سکتیں اس لیے دونوں کی دونوں رسمیں بھی اچھی نہیں ہو سکتیں۔ پس رسومات متناقضہ کا موجود ہونا ہی کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ رسومات کا توڑنا اور تبدیل کرنا اور ترقی دینا نہایت ضروری ہے۔

اس بات کے ثبوت کے لیے کہ مختلف قوموں میں تینوں قسم کی متناقض رسومات موجود ہیں ان قوموں کی رسومات پر جو مذہب حکومت اور معاشرت سے متعلق ہیں غور کرنا کافی ہے۔

دیکھو اگلے زمانہ کے یونانیوں اور مصریوں اور ہندوستان کے ہندوؤں کو جو مذہبی رسومات میں بیسیوں دیوتاؤں کو ماننا اور ان کی پرستش بجالانا اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر یہودی اور مسلمان ٹھیک اس کے برخلاف ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سوائے ایک خدا کے کسی دوسرے کی پرستش کرنا ٹھیک جہنم میں جانا ہے۔

یہودی اور مسلمان اور ہندو جنگ کے وقت اپنی نجات کے لیے قربانیاں کرتے ہیں مگر ایک بدھ مذہب کا پیرو اس کو بہت بڑی ہتیا اور سخت عذاب کا کام سمجھتا ہے۔

ہندو اور رومن کیتھولک اپنے پیشواؤں کی مورتوں کے سامنے پرستش کرنا کس قدر روحانی خوشیوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر یہودی اور پروٹسٹنٹ اور مسلمان اس کو روحانی موت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ ایک نہایت نیک دل ہندو نہایت سچائی اور دلی اعتقاد سے اور بیکنٹھ میں جانے کے یقین سے ایک دیوتا کی مورت پر اپنی جان کو آپ قربان کرتا ہے۔ مگر عرب کے ریگستان کا قانون بنانے والا ایسے فعل کو خودکشی قرار دیتا ہے اور اس کے کرنے والے کو نرک میں ڈالتا ہے۔

ایک ہندو اپنے پیارے باپ کی لاش کو کس محبت اور عزت اور نیکی اور ابدی نجات کے یقین سے نہایت خوفناک اور تیز بھڑکتی آگ میں جلاتا ہے اور پھر اس کی جلی مٹی سے اس کی ہڈیوں کو چنتا ہے اور ان کا نام پھول رکھتا ہے اور پھر گنگا میں بہاتا ہے۔ مگر ایک یہودی یا عیسائی یا مسلمان اس کو نہایت بے رحمی اور سنگ دلی کا کام سمجھتا ہے۔ وہ کسی مجرم کی لاش کو بھی آگ میں ڈالنا سخت گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں بھی نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اپنے عزیز کی لاش کو خود اپنے ہاتھوں جلتی آگ میں ڈال دیا جائے۔ پس یہ بات غور کے قابل ہے کہ مذہبی رسومات بھی ایک قوم کی دوسری قوم سے کیسی مخالف ہیں۔

رسومات جو حکومت سے متعلق ہیں وہ بھی باہمی اختلاف رسومات کے اندازہ سے مختلف ہیں۔ ایک ٹکڑا امریکہ کا غلاموں کو آزاد کرنا گورنمنٹ کا ایسا ہی فرض سمجھتا تھا جیسا کہ دوسرا ٹکڑا مالکوں کا حق غلاموں پر قائم

رکھنا واجب جانتا ہے۔ زنجبار کا بادشاہ غلاموں کی سوداگری کو ایک عمدہ اور نہایت پاک محاصل بادشاہی خزانہ کا سمجھتا ہے مگر انگلینڈ کی ملکہ اس کے معدوم کرنے کو جنگی جہاز روانہ کرنے پر آمادہ ہوتی ہے۔

اسی ہندوستان کی پہلی حکومت میں دختر کشی ایک رسم ناقابل مزاحمت اور ستی ایک رسم قابل ادب اور تعظیم کے تصور کی جاتی تھی مگر فورٹ ولیم کا قانون بنانے والا اس کو قتل انسان مستلزم سزا کا جرم قرار دیتا ہے

معاشرت و تمدن کی رسومات کے اختلاف کی تو کچھ انتہا ہی نہیں ہے۔ ایک قوم کو دیکھتے ہیں کہ وہ سر ننگا کرنا اور پاؤں میں جوتی پہنے رہنا نہایت تعظیم و ادب کا ادا کرنا سمجھتی ہے مگر میں سنتا ہوں کہ ہندوؤں میں سر ڈھانکے رہنا اور جوتی اتار کر ننگے پاؤں ہو جانا غایت درجہ ادب و تعظیم کا کام سمجھا جاتا ہے (میں نے ہندوؤں کی تخصیص اس مقام پر اس لیے کی کہ مسلمانوں میں جوتی اتار کر ننگے پاؤں ہونا داخل ادب نہیں ہے) سب سے بڑا معاملہ معاشرت اور تمدن کا شادی و بیاہ سے متعلق ہے۔ ایک قوم کی خوبصورت نیک لڑکی نہایت پاک مگر محبت سے بھرے ہوئے دل سے اپنے لیے آپ شوہر پسند کرتی ہے مگر ہندوستان کی قوم کی لڑکی بیاہ کے بعد بھی کبھی اپنے شوہر سے بات تک نہیں کرتی۔

دیکھو کثرت ازدواج یعنی ایک سے زیادہ شادی کرنی ایک قوم میں کس قدر معیوب اور کیسی قابل نفرت قرار پائی ہے مگر ہندوستان کی ایک قوم کولین میں یہ رسم کیسی عمدہ اور مبارک سمجھی جاتی ہے۔ ستر برس کے بڈھے سے سات برس کی لڑکی کی جو اکثر دیں جورو اس بڈھے کی ہوتی ہے شادی کی جاتی ہے اور شادی کرنے والے اس شادی کو بہت بڑا پن اور نہایت ہی عمدہ کام سمجھتے ہیں۔ اور قوم کے ہندو بھی کثرت ازدواج کو معیوب نہیں سمجھتے اور مسلمان بھی چار تک اور ان کا ایک فرقہ کولین فرقہ سے بھی بڑھ کر لا انتہا تک کثرت ازدواج کو معیوب نہیں سمجھتا مگر یورپ کی سوسائٹی میں کثرت ازدواج پر مثل ایک سنگین جرم کے سزا دی جاتی ہے۔

آپ زیادہ تر تعجب کریں گے جب کہ آپ اس قوم کی رسم پر غور کریں گے جو کوہستان سراج کا رعلاقہ کانگڑہ میں آباد ہے اور جو کینت کہلاتی ہے اور جن میں یہ رسم ہے کہ چار یا پانچ بھائیوں میں صرف ایک عورت ہوتی ہے۔ یعنی وہ سب ایک سے شادی کرتے ہیں اور وہ سب کی جورو ہوتی ہے جو شوہر خلوت کے مکان میں اس کے پاس جاتا ہے اپنی لاٹھی جوتی باہر چھوڑ جاتا ہے تاکہ دوسرا شوہر ان نشانیوں کو دیکھ کر الٹا پھر جائے۔

اس پہاڑی ملک کو ایک وحشی ملک سمجھ کر حقیر مت سمجھو۔ اسپارٹا ایسے ملک میں بھی ایک زمانہ میں ایسی ہی رسم تھی۔ وہاں کے مرد بغیر خاص وجہ کے ایک سے زیادہ شادی نہ کر سکتے تھے۔ وہاں کی عورتیں ایک سے زیادہ خصم کرنے کی بلا قید مجاز تھیں اور کئی کئی خصم ساتھ رکھتی تھیں۔

جس طرح کہ ہم لوگ ایک عورت کے کئی منصم ہونا معیوب سمجھتے ہیں اسی طرح وہ لوگ ایک مرد کی کئی جورو وال ہونا سخت عیب اور نہایت ہی عجیب بات خیال کرتے ہیں۔

ایک چینی جن میں دانتوں کا سیاہ کرنا نہایت پیاری رسم ہے جب یورپ میں جاتا ہے تو تمام لیڈیوں کے سفید اور موتی ایسے آبدار دانت دیکھ کر نہایت ہی متعجب ہوتا ہے اور جب ان کو چلتا پھرتا دیکھتا ہے تو اور بھی تعجب میں پڑتا ہے کیونکہ چینیوں میں عورت کے پاؤں لوہے کے شکنجے چڑھا کر ایسے چھوٹے کر دیتے ہیں کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتیں۔

اگر کوئی اشراف مسلمان خاندان کی عورت عربی گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں نکلے تو کون سا عیب ہے جو اس پر نہ لگایا جائے۔ مگر تم اسی ہندوستان میں ایک تربیت یافتہ اور فتح مند قوم کو دیکھتے ہو کہ ان کی تمام لیڈیاں مثل مردوں کے باہر پھرتی ہیں اور عجائبات قدرت الٰہی کو دیکھتی ہیں اور قدرتی چیزوں کے دیکھنے اور ملکوں کے سیر کرنے اور دریاؤں اور جنگلوں کے تماشے دیکھنے سے مردوں کی مانند علم و عقل و تربیت حاصل کرتی ہیں۔ شاید تمہاری نگاہ میں یہ ہنر عیب ہو مگر جس کو تم ہنر سمجھتے ہو اس کو وہ نہایت سخت عیب سمجھتی ہیں۔

کیا آپ لوگ اس رسم کو عجیب اور نہایت ہی عجیب نہ سمجھیں گے کہ میسور کی ایک قوم میں یہ رسم ہے کہ جب کسی عورت کے ہاں اوّل مرتبہ لڑکا پیدا ہوتا ہے یا بانجھ عورت لڑکے متبنیٰ کرتی ہے تو اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں کی ایک ایک پور کٹوا ڈالتی ہے اور اس کو نہایت ہی مبارک سمجھتی ہے۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ کے میں نے آپ کے سامنے بیان کیں ورنہ بہت سی ایسی رسمیں نکلیں گی کہ جن کو ایک قوم نہایت اچھا اور دوسری نہایت ہی برا سمجھتی ہو گی اور چونکہ وہ دونوں رسمیں آپس میں برخلاف ہیں اس لیے وہ دونوں رسمیں اچھی نہیں ہو سکتیں۔ یا وہ دونوں بری ہوں گی یا ان میں سے ایک اچھی ہو گی اور ایک بری ہو گی پس اگر رسمو ں کی پابندی کی جائے تو ضرور کوئی نہ کوئی قوم ایسی رسموں میں جو درحقیقت بری اور خراب ہیں مبتلا رہے گی۔

جو لوگ رسموں کی پابندی کے طرفدار ہیں ان سے یہ سوال ہوتا ہے کہ جن رسموں کی تم پابندی چاہتے ہو وہ رسمیں بھی بعد اصلاح و ترمیم و تبدیل کے تمہارے بزرگوں نے قائم کی تھیں کیونکہ تمہارے بزرگوں کے بزرگ اس سے بھی زیادہ وحشیانہ رسموں میں مبتلا تھے۔ پس جب کہ ہمارے بزرگوں نے اپنے بزرگوں کی رسموں کو اصلاح کیا ہے تو ہم اپنے بزرگوں کی رسموں کو جو اصلاح کے قابل ہوں کیوں نہ اصلاح کریں۔

اگر رسموں کی اصلاح کرنا ابتدا سے انسان کی نسلوں میں جاری نہ ہوتا اور ابتدا سے تمام انسان رسموں کی پابندی

کے ایسے ہی طرفدار ہوتے جیسا کہ ٹیسی ٹس - ورجل - کرے سسم - اور مسٹر گولڈ اسمتھ تھے جن کے قول اوپر میں نے بیان کئے تو آپ جانتے ہیں کہ ہماری تمہاری کیا حالت ہوتی - ہم میں سے کسی کے آگے پیچھے کسی درخت کے دو پتے بندھے ہوتے اور کسی کے کسی جانور کی بالوں دار کچی کھال لپٹی ہوتی اور عدن کے درختوں کی آڑ میں بیٹھے ہوئے خدا کے گیت گایا کرتے - پس جو لوگ رسموں کی اصلاح و ترقی کے برخلاف ہیں وہ خود اس میں مبتلا ہیں جس سے لوگوں کو منع کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک ترقی یافتہ زمانہ کی رسموں کو پکڑتے ہیں اور دوسرے ترقی یافتہ زمانے کی رسموں کے پکڑنے سے انکار کرتے ہیں -

تمام کام جو رسم کے برخلاف کئے جاتے ہیں ابتداءً سب کو برے معلوم ہوتے ہیں - اس کا بڑا سبب بے علمی اور جہالت ہے کیونکہ ان کی بے علمی یا ناقص تعلیم ان کی تعلیم کو اس قدر قوت نہیں بخشتی کہ وہ رسومات کے اس تعصب اور جہالت اور ہٹ پر جو عادتاً ان کے دل میں بیٹھی ہوئی ہے غالب آئے اور نہایت انصاف سے دیکھے کہ رسوماتِ معینہ میں درحقیقت کیا نقص ہیں اور ان کی ترقی اور اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں -

ایک عادل اور منصف گورنمنٹ کو جو اپنی رعایا کی ترقی بھی چاہتی ہو قانون بنانا اور ان کو جاری کرنا نہایت ضرور ہیں جب کہ رعایا کی حالت - ان کی عادت اور اُن کے خیالات اور ان کے معاملات اور ان کی معاشرت تبدیل ہوتی جاتی ہے - یا نئے قسم کے حقوق اور نئی طرح کی ملکیت پیدا ہوتی ہے یا خود گورنمنٹ کو اپنے استحکام اور استقلال کے لیے نئے انتظاموں کی ضرورت پیش آتی ہے تو پرانی رسومات کے موافق چلنے سے کام نہیں چلتا اور بلاشبہ قوانین جدید بنانے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ہم تمام تربیت یافتہ گورنمنٹوں میں نئے نئے قانون جاری ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں - ہاں یہ بات میں دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ ایسے قوانین کا جاری ہونا بصلاح اور مشورہ رعایا کے نائبوں کے ہونا چاہیئے -

رسومات کی اصلاح و ترقی جس طرح کہ انسان کے ظاہری طریقہ زندگی کو فائدہ دیتی ہے اسی طرح اس کی عقل کو بھی ترقی دیتی ہے - ایک بات کے پیچھے لگے رہنے اور اسی لکیر پر چلے جانے سے انسان کی عقل سو جاتی ہے اور قوتِ ایجاد جو خدا نے انسان میں رکھی ہے وہ معطل بلکہ قریب معدوم ہونے کے ہو جاتی ہے اور اس سبب سے قومی تنزل شروع ہو جاتا ہے کیونکہ قوتِ ایجاد کے معطل ہونے سے تمام علوم و فنون میں فتور آ جاتا ہے اور کسی چیز میں ترقی نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ جولاہے اور بڑھئی اور لوہار بھی اپنے اپنے پیشہ میں نہ کچھ ترقی کر سکتے ہیں اور نہ کچھ ایجاد کرتے ہیں - اور ٹھیک ٹھیک یہی حال ہندوستان کا رسومات کی پابندی سے ہو گیا ہے -

رسومات کی اصلاح اور ترقی کے وقت بلاشبہ یہ نازک مسئلہ بحث میں آتا ہے کہ کونسی رسم اچھی اور کونسی بری ہے

اور اس کا جانچنا اور تصفیہ کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اور نہ اس پر بحث کرنا اس وقت میرا مقصد ہے مگر زمانہ اور تعلیم اور تربیت خود اچھی اور بُری رسموں کو جدا جدا کرتا اور بتلاتا جاتا ہے۔

ہم میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ان رسموں سے جن کو وہ کرتے ہیں بہت سی رسموں کو بُرا سمجھتے ہوں گے۔ اور ان کی اصلاح و ترقی کی بھی نہایت خواہش رکھتے ہوں گے۔ مگر اس بات میں متحیر ہوں گے کہ کیونکر ان کو چھوڑیں۔ اور کس طرح ان کی اصلاح و ترقی کریں۔

بعضوں کا یہ خیال ہے کہ اگر گورنمنٹ دست اندازی کرے یا صاحب کلکٹر توجہ فرمائیں تو ہم کو ان بد رسموں کا اپنی قوم سے چھڑانے کا اور سب کو دھمکا کر راہ پر لانے کا موقع ملے۔ اُن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم بدنامی سے محفوظ رہیں اور گورنمنٹ کو لوگ بدنام کریں اور گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دلوں میں بوئیں اور جو لوگ اس سے زیادہ سنجیدہ اور متین اور معقول ہیں وہ ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ اگر برادری کا اتفاق ہو اور بزرگ بزرگ لوگ اس کو کرنے لگیں تو یہ کام چل جائے مگر نہ کبھی کسی رسم کے چھوڑنے یا بدلنے پر اتفاق ہوتا ہے اور نہ کسی رسم میں اصلاح و ترقی ہوتی ہے بلکہ اسی تاریکی کی حالت میں زمانہ کا زمانہ گزرا جاتا ہے۔

اکثروں کا یہی خیال ہے کہ آپس میں اتفاق ہو تو رسموں میں اصلاح و ترقی ہو گویا وہ اصلاح و ترقی کو اتفاق پر منحصر رکھتے ہیں مگر میں اس رائے سے بالکل مختلف ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رسموں کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اتفاق نہیں ہے بلکہ اختلاف ہے۔ جس شخص کے دل میں اصلاح و ترقی کا خیال ہو اس کو چاہیئے کہ خود نہایت استقلال اور مضبوطی سے تمام قوم سے اختلاف کرے اور اس رسم کو توڑے یا اس میں اصلاح و ترقی کرے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام قوم اس کو بُرا کہے گی اور نکو بنائے گی مگر رفتہ رفتہ لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں گے اور جس طرح کہ اولاً وہ ہدف تیر ملامت ہوا تھا انجام کو وہی سب کا ہادی اور پیشوا اور مصلح قوم شمار کیا جائے گا۔ جب تک کوئی شخص تمام قوم سے اختلاف کر کے رسم کو نہ توڑے وہ رسم موقوف ہی نہیں ہو سکتی۔ پس یہی ایک طریقہ اختلاف ہے جس سے قوم کی اصلاح و درستی ہو سکتی ہے اور ایسا کرنے والا ہی سچا خیر خواہ اپنی قوم کا متصور ہے پس میں اپنے عزیز ہموطنوں سے کہوں گا کہ چپکے چپکے اپنے فرقہ کے لوگوں میں بیٹھ کر رسموں کو بُرا کہنا اور ان کی اصلاح و درستی کے لیے ساتھیوں کو ڈھونڈنا اور قید سے نکلنے کے لیے قافلہ کی راہ دیکھنا محض بے فائدہ اور سراپا غلطی ہے۔ جو شخص بہادر ہے اور اپنی قوم کا سچا خیر خواہ اس کو خود اس بھاری بیڑی کو توڑ کر میدان میں آنا چاہیئے تاکہ لوگوں کو بھی اس قید سے نکلنے کی جرأت اور ہمت ہو۔

اگلے اور حال کے زمانہ میں جن لوگوں نے اپنی قوم کی بھلائی چاہی انہوں نے اسی طریقہ پر عمل کیا ہے

اور آج تک دنیا میں کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ بغیر اس طریقہ کے کسی دوسرے طریقہ سے قومی ترقی اور بد رسومات کی اصلاح ہوئی ہو۔ میرا یہ دعویٰ چند عمدہ اور قابل ادب قدیم زمانہ کی مثالوں سے اور نیز جو واقعات کہ اس زمانہ گذر رہے ہیں ان پر بطور تمثیل غور کرنے سے بخوبی ثابت ہو سکتا ہے۔

دیکھو اس زمانہ سے ساڑھے اڑتیس سو برس پیشتر "اور کلدانیاں" میں ایک جوان تھا جس کو ابراہیمؑ کہتے تھے اس نے اپنی قوم کو بت پرستی میں پڑا اور بہت سی بد رسموں میں پھنسا ہوا دیکھا۔ اس کا دل اپنی قوم کی خراب حالت پر جلا۔ خدا نے اس کی مدد کی۔ وہ اپنی قوم کے برخلاف کھڑا ہوا اور پکار کر یہ بول اٹھا انی وجہت وجہی للذی فطر السمٰوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔ تمام قوم نے اس کو لعنت ملامت کی۔ قتل کرنا چاہا۔ آگ میں ڈالنا چاہا۔ مگر خدا نے اس کو بچایا اور پھر انجام یہ ہوا کہ وہی ابراہیمؑ تمام دنیا کی قوموں کے لیے رحمت ٹھہرا صلواۃ اللہ علیہ وعلی آلہ۔

پھر خدا کی اس قربانی کی بھیڑ کو دیکھو جس کا اسی کی قوم نے اپنی دانست میں نہایت بے رحمی اور سنگ دلی سے کالوری پہاڑی کے نیچے بیت المقدس کے پاس خون بہایا۔ اس بے گناہ کا یہ گناہ تھا کہ اپنی قوم کی رسومات کی برائی کرتا تھا۔ اُن کو بد ذاتی اور ریا کاری سے منع کرتا تھا۔ اس کا یہ گناہ تھا کہ اس نے فروسیوں سے کہا کہ تم پیالے ڈاسن کو باہر سے صاف کرتے ہو پر تمہارا اندر ظلم و برائی سے بھرا ہوا ہے۔ اے فروسیو تم پر افسوس کہ ترکاریوں کا دسواں حصہ دیتے ہو پر انصاف اور خدا کی محبت سے گزرتے ہو۔ اے فقیہوں تم پر بھی افسوس کہ جن بوجھوں کا اٹھانا تم کو مشکل ہے اس کو لوگوں پر ڈالتے ہو اور انگلی تک نہیں لگاتے۔ یہ سچ ہے کہ راست بازی نے اس کو نہایت مصیبت میں ڈالا اور خود اسی کی قوم کے ہاتھ سے اس پر جو کچھ گزرنا تھا گذرا مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ تینتیس کروڑ پچاس لاکھ آدمیوں نے اس کو خدا کا اکلوتا بیٹا مانا اور سولہ کروڑ آدمیوں نے اس کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ جانا۔

دیکھو ریگستان عرب کے ہادی کو جس نے اپنی قوم کو لات و منات و عزیٰ کی پرستش سے چھڑایا اور اولاد کے قتل سے بچایا گو کہ اسی کی قوم نے اسی کو ستایا اور وطن سے نکالا مگر انجام کو خدا کا آخری پیغمبر مانا اور اسی کی بدولت سب نے خدائے واحد کو پہچانا صلی اللہ علیہ وسلم۔

سقراط کا واقعہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ اس نے نہایت نیکی اور نیک دلی سے اپنی قوم کی بھلائی پر کمر باندھی۔ ان کی بد رسموں کی اصلاح چاہی مگر اسی کی قوم نے اس پر دیوتاؤں کے برا کہنے اور ایتھنز کے نوجوان لڑکوں کے بہکانے کا الزام لگایا۔ یہاں تک کہ زہر کے پیالے سے اس کو مارا مگر چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ تمام ایتھنز کے رہنے والوں نے اس کا ماتم کیا اور تمام دیوتاؤں سے اس کو بڑا دیوتا مانا۔

مارٹن لوتھر کا ذکر بھی اس موقع کے نامناسب نہیں ہے جس نے عیسائی چرچ کی تمام بدرسموں کا مقابلہ کیا اور اپنی سچائی پر نہایت استقلال سے قائم رہا۔ پلاطوس کے سیڑھی پر نجات کی امید میں گھٹنوں کے بل چڑھتے وقت یہ غیبی آواز اس کے کان میں آئی کہ "سچے ایمان سے نجات پاسے گا" اسی پر وہ مستقل رہا اور اسی کا وعظ اپنی قوم میں کیا۔

وتم برگ کے چوک میں جو آگ جلائی گئی اس سے کچھ خوف نہیں کیا اور پوپ کے برخلاف اتوار کے دن گرجا میں جلا کر بولا کہ "خدا تعالیٰ برخلاف اپنی عدالت اور صداقت کے گناہوں کے بدلے دام نہیں لیتا۔"

اسی نے اپنی جان کا خوف نہ کر کے کارڈینل کی اس گفتگو کے وقت کہ پوپ کو سب باتوں پر اور ساری چیزوں پر اختیار ہے یہ کہا کہ ہاں مگر پاک کتاب پر نہیں۔

اسی کی قوم نے اس بھلائی کے عوض اس کو خوب ستایا اور اس نے نہایت افسوس سے لکھا کہ "یہ کیسا زمانہ ہے کہ سچائی کا طالب ہونا ایک بڑی تقصیر معلوم ہوتی ہے۔" مگر آج وہی لوتھر ہے جس کا نام کروڑوں عیسائیوں کے دل میں نہایت مقدس ہے۔

امام حجۃ الاسلام غزالی کا نام لیے بغیر میں اس فہرست کو ختم نہیں کر سکتا جس نے اسرار مسائل اسلام کے بیان کرنے میں تا بہ مقدور اپنے سعی و کوشش کی اگرچہ بڑے بڑے متعصب مولویوں نے اس کے کفر کے فتوے دیئے اور اس کی کتاب احیاء علوم الدین کے جلانے کا حکم دیا اور اس کے قتل کے عام احکام جاری ہوئے مگر انجام کار وہی غزالی امام اور حجۃ الاسلام کے لقب سے پکارا گیا۔

اس زمانہ میں جو واقعات گذرتے ہیں اور جن کو اکثر لوگوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہوگا وہ بھی یہی ہیں کہ جس شخص نے رسومات کی اصلاح و ترقی چاہی فی الفور اس نے اپنی تمام قوم سے مخالفت کی اور رفتہ رفتہ لوگ اس کے ساتھ ہوتے گئے۔ (تہذیب الاخلاق)

سرگزشت غزالی ۔ مترجمہ محمد حنیف ندوی

امام غزالی کی "المنقذ" کا اردو ترجمہ جس میں انہوں نے اپنے فکری و نظری انقلاب کی دلچسپ داستان بیان کی ہے اور بتلایا ہے کہ کس طرح انہوں نے جبہ و دستار اور مسند و دستار کی زندگی چھوڑ کر گلیم و فقر کی روش اختیار کی اور تصوف کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ قیمت ۲ روپے

ملنے کا پتہ:۔ سکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور